ترقی پسند تحریک کا سیاسی پس منظر

عبداللہ صوفی، شعبۂ اردو
یونیورسٹی آف دہلی
Email: abdullahsufi25@gmail.com

ملخص

پلاسی اور بکسر کی جنگ کے بعد انگریزوں کو ہندوستان میں اپنا مستقبل روشن نظر آنے لگا۔ 1857 میں ناکام غدر کے بعد انگریز پوری طرح ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ غدر کے بعد انگریزوں نے اپنا عتاب مسلمانوں پر نکالا۔ مسلمانوں کو اس تنزلی سے نکالنے کے لئے سرسید کمر بستہ ہوئے۔ سرسید نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو اس تنزلی سے نکالنے کی فکر کی بلکہ تحقیق کر کے ان اسباب وعلل کا پتہ لگایا جس کی وجہ سے مسلمان احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے۔ سرسید کی اس کوشش کو علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے بعض لوگ علی گڑھ تحریک سے بیزار ہونے لگے۔ اس طرح سے رومانوی تحریک کا آغاز ہوا۔ اور پہلی عالمی جنگ کے بعد دنیا بھر کے ادیب مورکسی نظریہ سے متاثر ہوئے، ملک ہندوستان بھی اس سے الگ نہ رہا اور ملک راج آنند اور سجاد ظہیر کی کوششوں سے ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدا 1602 میں ہوئی اس وقت ہندوستان میں جہانگیر کا دور تھا اگلے 150 سالوں تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کی اور مغلوں کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار رکھے۔ 23 جون 1757 میں میر جعفر کی غداری کے سبب انگریزوں نے بنگال کے نواب سراج

الدولہ کو پلاسی کی جنگ میں شکست دی .اس کے بعد سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قدم مضبوطی سے ہندوستان میں جما لیے، آئندہ سو سالوں تک انگریزوں نے اپنی سازشوں سے ہندوستان کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی اور 1857 میں بالآخر مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو تخت سے اتار کر شہر بدر کر دیا گیا اور پورا ہندوستان انگریزی حکومت کے تسلط میں آ گیا۔1876 میں ملکہ وکٹوریہ کو باقاعدہ ہندوستان کی مہارانی بنا دیا گیا۔

1757 میں پلاسی کی جنگ کے بعد سے ہی انگریزی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کو مکمل طور سے قبضے میں لینے کی کوشش کی۔1765 میں بکسر کی جنگ کے بعد انگریزی حکومت کے لیے ہندستان کے راستے کھلتے چلے گئے۔دوسری طرف مغل شہنشاہوں میں تخت وتاج کے حصول کے لیے آپسی خوں ریزیاں جاری تھیں لہذا انگریزوں کو مزید خون بہانے کی ضرورت نہ پڑی۔ پلاسی اور بکسر کی جنگ کے بعد انگریزوں کو ہندوستان میں اپنا مستقبل روشن نظر آنے لگا۔ اسی مقصد کے تحت فورٹ ولیم میں ایک کالج کا قیام عمل میں آیا کالج میں انگریز افسروں کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کے لیے اطالیق مقرر کئے گئے اور پھر نصاب کے تحت آسان زبانوں میں کتابیں تیار کی گئیں۔زبان کے تعلق سے انگریزوں نے ہندوستان میں اس کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ طاقت ملتے ہی انگریزوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کو ہدف بنایا 1837 میں فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کردی گئی جس کا صاف طور پر اشارہ یہ ہوا کہ جو لوگ بھی فارسی سے قریب ہیں انہیں سرکاری پالیسیز سے محروم رکھا جائے گا 1857 میں ناکام غدر کے بعد انگریز پوری طرح ہندوستان پر قابض ہو گئے لہذا فورٹ ولیم کالج کو مقصد حاصل ہو جانے کے سبب 1858 میں بند کر دیا گیا۔

غدر کے بعد انگریزوں نے اپنا عتاب مسلمانوں پر نکالا۔مسلمان پست سے اور پست ہوتا چلا گیا۔ذہنی طور سے بھی مسلمانوں پر جمود طاری تھا۔مسلمانوں کو اس تنزلی سے نکالنے کے لئے سرسید کمر بستہ ہوئے۔سرسید نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو اس تنزلی سے نکالنے کی فکر کی بلکہ تحقیق

کر کے ان اسباب وعلل کا پتہ لگایا جس کی وجہ سے مسلمان احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے۔ان اسباب میں سب سے بڑی وجہ انہوں نے مسلمانوں کے اندر جدید تعلیم سے بیزاری کو پایا۔انہوں نے اس بات بات پر بھی غور کیا کہ ابھی تک ہندوستان میں جو ادب لکھا جا رہا ہے اسے وقت اور حالات کے تقاضوں پر تبدیل ہونا چاہیے۔ یہ وہ پہلا موقع تھا جب ہندوستانی ادب کو سوچ سمجھ کر ایک نئی نہج دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔سرسید نے اس پر خود بھی عملی طور سے کام کیا اور تہذیب الاخلاق رسالے کا اجرا کیا اور مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کا یہ طریقہ ڈھونڈا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا رخ اس طرف بھی موڑا جائے جہاں وہ نہ صرف سائنس اور جدید علوم وفنون سے واقف ہوں بلکہ اپنی جدید تعلیم کے توسط سے برطانوی حکومت کے کے عہدوں پر بھی فائز ہو سکیں۔

سرسید کے اسی سیاسی شعور اور دور اندیشی کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''سیاست کے تعلق سے ضروری ہے کہ سرسید کے زمانے کا خیال رکھا جائے کیونکہ سیاست ہمیشہ ایک وقتی چیز ہوتی ہے اور اس کے اصول مصلحت وقت کے تابع ہوتے ہیں۔سرسید کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بدلتے ہوئے زمانے کا احساس کر کے، مغلوں کی مٹتی ہوئی حکومت وسلطنت کو چھوڑ کر، جس سے ان کا خاندان برسوں سے وابستہ تھا، انگریزی حکومت کی ملازمت کو ترجیح دی اور جب اس پر وقت پڑا تو انہوں نے جس طرح انگریزوں کا ساتھ دیا، ان کی مشہور تاریخی تصنیف "سرکشی ضلع بجنور" اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔سرسید کو یقین تھا کہ انگریزی حکومت حال و مستقبل کی حکومت ہے اور چونکہ اس کی اساس عہد حاضر کے انداز نظر پر قائم ہے، اس لیے انگریزوں کی حمایت وقت کا تقاضہ ہے اور اسی لیے وہ اپنی قوم کو ان کے ساتھ ملانے اور چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ان کے

سیاسی شعور نے مصلحت وقت کا صحیح اندازہ کرلیا تھا اور محض جذباتیت وعینیت (Idealism) سے کنارہ کش ہوکر مستقبل میں مسلمانوں کی کامیابی کے لیے، اسی راستے پر چلنے کا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ وہ ساری عمر اسی سمت میں سفر کرتے رہے۔ "اسباب بغاوت ہند" میں وہ پہلی بار حکومت اور رعایا کے تعلقات کے اصول اخذ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جو ہر دور میں سیاست کی بنیاد ہوتے ہیں۔''

اردو میں سرسید نے ادب کو ایک نئی جہت، ایک نیا رخ عطا کیا۔ بعض معنوں میں وہ اردو میں جدید نثر کے بانی کہے جاسکتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ سرسید سے پہلے میر امن کی باغ و بہار اور غالب کے خطوط کے ذریعے اردو نثر میں عام بول چال کی زبان کا استعمال شروع ہو چکا تھا مگر سرسید کی نثر گزشتہ لکھی گئی نثری تحریروں سے اس طور سے مختلف ہے کہ اس میں عام بول چال کی زبان کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے قاعدے اور اصول کی پابندی نظر آتی ہے۔ یعنی خطوط غالب کو پڑھنے سے محسوس ہوگا کہ کوئی بول رہا ہے جب کہ سرسید سید کی تحریروں کو پڑھ کر لگتا ہے کہ مصنف لکھ رہا ہے۔ سرسید کی نثر کے عمدہ نمونے ہم ان کے مضامین میں دیکھ سکتے ہیں۔ سرسید جنھیں اردو میں مضمون نگاری کا بانی کہا جاتا ہے اپنے مضامین میں استدلالی نثر کا استعمال کرتے ہیں انھوں نے خود کو ایک ادیب یا مصنف سے بڑھ کر قوم کا رہبر اور رہنما سمجھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے خیالات کو واضح کرنے کے لئے دلائل کا استعمال کیا۔ اس وقت مسلمانوں پر غیر ضروری مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا وہ ہر نئی چیز کو مذہب کی عینک لگا کر دیکھتے تھے اس لیے سرسید کو اپنے خیالات یا مقصد کو پیش کرنے کے لیے مذہبی حوالوں اور سائنسی دلیلوں کی ضرورت پیش آئی۔

سرسید کی اس کوشش کو علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے علمبرداروں میں سرسید کے ساتھ حالی، شبلی، آزاد اور مولوی نذیر احمد کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جہاں مسلمان دنیاوی زندگی سے مایوس ہوکر اخروی زندگی کی طرف اس طور سے مائل

ہور ہے تھے کہ ان کے دلوں میں دنیا سے بیزاری کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ ایسے میں سرسید اور ان کے رفقاء نے مقصدی ادب کی طرف بھی زور دیا یعنی ادب صرف دل بہلانے یا حظ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے کسی نہ کسی مقصد کے تحت استعمال کرنا چاہیے۔ علی گڑھ تحریک کے ذریعے اسی طرح کے مقصدی ادب کو فروغ ملا جس سے عوام الناس پر ادب کے افادی پہلو روشن ہوئے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے ادب کو ایک افادی شئے کے طور پر پیش کیا۔ علی گڑھ تحریک کی یہی چیز ترقی پسند تحریک سے سب سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔

علی گڑھ تحریک اپنے ٹھوس اور جامد احساسات، مقصدیت اور اجتماعی فلاح کے نظریے کی وجہ سے جلد مقبول ہوگئی۔ لیکن مغرب سے آیا یہ نظریہ مشرقی عوام کو ماضی کی قدیم روایات سے یکسر ہٹا نہ سکا۔ یہاں کی عوام کا مزاج ضرور اس سے متاثر ہوا لیکن روحانی مزاج اور مذہبیت کی وجہ سے جلد ہی کچھ لوگ اس ٹھوس مادیت اور مقصدیت کے نعرے سے اکتا گئے لہٰذا انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے بعض لوگ علی گڑھ تحریک سے بیزار ہونے لگے۔ ایسے لوگوں میں آزاد، میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر تھے انہوں نے اپنی تحریروں میں جذبات کی فراوانی کو مثبت انداز میں پیش کیا۔ بعد کے لوگوں نے انہیں بزرگوں کی تحریروں کو بنیاد بنا کر اردو ادب میں رومانی تحریک کی ابتداء کی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی شیخ عبدالقادر کی نگرانی میں رسالہ مخزن نکلنا شروع ہوا جو آگے چل کر باضابطہ اس تحریک کا حصہ بنا۔ اور جلد ہی یہ تحریک مقبول عام ہوگئی۔ اس تحریک کو قبولیت بخشنے میں ایک اور اہم وجہ جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس دور میں مسلمانوں کے اندر مذہبی اعتبار سے اپنی جداگانہ حیثیت کو سمجھنے کا رواج بڑھا چنانچہ مذہب کے احیاء کو اہمیت دی گئی۔ عبدالحلیم شرر کے ناولوں نے اسی نظریے کو مضبوطی فراہم کی۔ دوسری طرف سائنس اور جدید علوم کی ترقی نے مذہب اور مافوق الفطری عناصر کی نفی کی۔ برصغیر میں علی گڑھ تحریک کو بھی سائنس اور جدید علوم کے کافی قریب سمجھا جاتا رہا تھا۔ اسی ردعمل کے تحت رومانی تحریک کا آغاز ممکن ہوا۔ جس میں احیائے دین اور مذہبی اخلاقیات کو مضبوط کیا جانے لگا۔ اسی بات کو انور سدید اپنی کتاب اردو ادب کی

تحریک میں میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''انیسویں صدی کے آخر میں ہندی زبان کے فروغ نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس احساس کے زیر اثر جو مضبوط تحریک پیدا ہوئیں ان میں قدیم مذاہب کے احیاء کو اہمیت ملی۔ اہم بات یہ ہے کہ حقیقت پسندی کی تحریک مذہب کے الہامی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اور اس کے خلاف ردعمل بھی احیائے مذہب کی صورت میں رونما ہوا۔ چنانچہ مذہبی اخلاقیات کے اس قلعے کو جسے انگریزی تہذیب نے مسمار کرنا شروع کر دیا تھا دوبارہ مضبوط کیا جانے لگا۔ پرانی روایات اور قدیم اقدار کے خلاف نوجوان نسل کا ردعمل رومانی تصورات کی صورت میں رونما ہوا، اور اس نے فرد کو روایات کے بتان قدیم کو پاش پاش کرنے، اپنی داخلی آواز پر کان دھرنے اور نئے خیالات کی کونپلوں کو افزائش دینے پر آمادہ کیا۔ پس متذکرہ قدامت کے خلاف اس عہد کا عمرانی ردعمل رومانیت کی پرورش کے لیے ایک اہم عامل قوت کے طور پر کام کرنے لگا اور اس نے رومانی تحریک کے فروغ میں بڑی معاونت کی۔''

ایک دوسری جگہ وہ اسی تعلق سے مزید لکھتے ہیں کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ یوٹوپیا کا خوب تر جہان تخلیق کرنا رومانیت کا ایک پراسرار مگر اہم مقصد ہے اور ہندوستانی فرد میں یہ جذبہ حصول آزادی کی آرزو کی صورت میں بدرجہ اتم پیدا ہو گیا تھا تاہم سائنس نے انسان کے تیقن کو پارہ پارہ کیا تو اس عمل میں اولین سطح پر اس کی شخصی انا مجروح ہوئی۔ ثانیاً وہ نیابت الٰہی کی مسند سے اتر کر زمین پر گر پڑا۔ ثالثاً زمین کے ثقافتی

بوجھ نے اس کی روح کو گرانبار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے بسی کے عالم میں وہ حقائق سے گریز کرنے اور ایک خواب ناک فضا میں سانس لینے پر آمادہ ہو گیا۔''

رومانوی تحریک نے اردو شاعری کو بھی نئے بال و پر عطا کیے۔ انجمن پنجاب کی تحریک کے بعد اردو شاعروں کا انسانی فطرت اور کائنات کی جزئیات سے رشتہ منقطع ہو گیا تھا۔ شاعر فطری مناظر کا تو ذکر کرتا تھا لیکن وہ مناظر شاعر کی داخلی فطرت سے میل نہیں کھاتے تھے۔ رومانی تحریک میں اردو شاعروں کو آزاد ہو کر اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا موقع ملا۔ اس میں سب سے اہم نام علامہ اقبال کا ہے۔ اقبال کا شمار رومانی تحریک کے اولین اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ رومانی تحریک سے جڑے ہوئے شاعروں میں ایک اہم نام حفیظ جالندھری کا بھی ہے۔ ان کی شاعری میں عنفوان شباب کی بے فکری، خود نظری، لطافت و نزاکت، استغنا و انانیت سبھی کچھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی زمرے میں ایک اہم نام عظمت اللہ خاں کا بھی ہے۔ بقول انور سدید عظمت اللہ خان کے مزاج میں رومانیت کا وہ عنصر موجود تھا جو موجود حقیقت کو منقلب کرنے اور نئے افق تلاش کرنے پر فرد کو آمادہ کرتا ہے۔ اس سے جڑے ہوئے شاعروں میں مزید نام جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، احسان دانش، اختر انصاری، روش صدیقی، ساغر صدیقی، الطاف مشہدی وغیرہ اہم شاعر ہیں۔

بیسویں صدی کا آغاز پوری دنیا میں سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی کا دور تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس وقت عالمی منظر نامے پر بڑے بڑے سیاسی انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ 1900ء امریکہ کا فلپائن پر قبضہ، بحرالکاہل میں امریکہ اور جاپان کا تصادم، روس اور جاپان کی جنگ، 1905 میں ہندوستان میں تقسیم بنگال کا مسئلہ، 1906 اور 1907 میں انگلستان اور فرانس کے مابین سیاسی سمجھوتے، 1908 میں پرتگال میں بغاوت وغیرہ ایسے مسائل تھے جس کا اثر عوام کی سیاسی، معاشی اور فکری زندگی پر پڑ رہا تھا۔ یہ سب وجوہات دنیا کو پہلی عالمی جنگ کی طرف لے گئے۔ لہٰذا 1914 میں جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ دوسری طرف دنیا بھر کے مزدور طبقے لیلن کی اگوائی

میں اکٹھے ہونا شروع ہوئے۔ بلآخر جنگ عظیم کے اختتام پر سرمایہ دارانہ نظام کی جڑیں کمزور پڑ گئیں۔ دنیا بھر میں مزدور یونین کے مختلف گروہ قائم ہوئے جو بین الاقوامی طور سے ایک مقصد کے تحت آواز بلند کرتے نظر آئے۔ اس وقت ساری دنیا کے ادیب اور دانشور اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں اپنی تحریروں اور کوششوں کے ذریعے کمزور اور مزدور طبقے کی حمایت کرنی چاہیے۔ اسی سلسلے جون 1935 میں پیرس میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان کی طرف سے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے شرکت کی۔ یہ دونوں لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی کانفرنس کے بعد انہوں نے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ جس کا پہلا جلسہ لندن کے نان کنگ ریسٹورنٹ میں منعقد ہوا۔ ملک راج آنند انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر چنے گئے۔ اس جلسے میں جو مینی فیسٹو تیار ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستانی ادیبوں کو چاہیے کہ وہ نامعلوم سے معلوم مقصد کی طرف رجوع کریں۔ بدلتی دنیا کے منظر نامے پر نظر رکھیں اور مزدور اور نچلے طبقے کی حمایت میں اپنا زور قلم صرف کریں اور واپس اپنے ملک میں جا کر اس تحریک کو آگے بڑھائیں۔ یہاں ہندوستان میں پہلے سے ایسے ادیب موجود تھے جو اس طرح کے نظریات کے تحت لکھ رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم نام منشی پریم چند کا ہے۔ چنانچہ جب لکھنؤ میں ترقی پسند تحریک کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تو پریم چند نے اس جلسے کی صدارت کی۔ ان کا صدارتی خطبہ ادبی زاویہ نگاہ سے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اپنے خطبے میں انہوں نے ادب کی بنیادی سچائی، حسن، آزادی اور انسان دوستی کو اہم قرار دیا۔ اس جلسے میں پریم چند کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کی تقدیر بھی خاص اہمیت کی حامل ٹھہری۔

یہی وہ جلسہ تھا جس سے ہندوستان میں باقاعدہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور چند ہی سالوں کے اندر لاہور، لکھنؤ اور حیدرآباد (دکن) تک کے علاقوں میں ترقی پسند تحریک کے مراکز قائم ہو گئے تھے۔ اردو اور ہندی کے ادیب اس کی کانفرنس میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتے۔ چند ہی سالوں میں یہ تحریک ہندوستان کی سب سے بڑی ادبی تحریک بن گئی۔